

نسائی شعور کی دو جہتیں: فہمیدہ ریاض اور کیفی اعظمی

نظم ”عورت“ اور ”انقلابی عورت“ کے حوالے سے

ڈاکٹر سفینہ

اسسٹنٹ پروفیسر، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی
تلخیص

فہمیدہ ریاض اور کیفی اعظمی نے اپنی نظموں میں عورت کے وجود، شعور اور سماجی مقام کو مختلف زاویوں سے پیش کیا ہے۔ کیفی اعظمی کے نزدیک عورت کمزور نہیں بلکہ معاشرتی تبدیلی کی ایک فعال قوت ہے۔ ان کی نظم عورت کو خود اعتمادی، عمل اور جدوجہد کا پیغام دیتی ہے اور اسے مرد کے شانہ بشانہ چل کر ایک بہتر معاشرہ تشکیل دینے کی دعوت دیتی ہے۔ اس کے برعکس فہمیدہ ریاض کی نظم عورت کے داخلی کرب، گزرے ہوئے وقت کے احساسِ زیاں اور سماجی پابندیوں کے باعث ادھورے رہ جانے والے خوابوں کی ترجمان ہے۔ ان کے ہاں انقلاب فوری عمل کے بجائے خود آگہی، تجربے اور زندگی کے طویل سفر کے بعد جنم لینے والی کیفیت ہے۔ دونوں نظموں کے تقابلی مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ کیفی اعظمی مستقبل کی تعمیر، عمل اور بیداری پر زور دیتے ہیں، جبکہ فہمیدہ ریاض ماضی کے تجربات سے سبق حاصل کرنے اور عورت کو اپنی شناخت بروقت پہچاننے کی تلقین کرتی ہیں۔ یوں اگرچہ دونوں کا انداز اظہار مختلف ہے، لیکن ان کا مشترکہ مقصد عورت کے وقار، آزادی اور خود شناسی کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک نظم عملی انقلاب کی دعوت دیتی ہے اور دوسری داخلی شعور کی بیداری کو انقلاب کی بنیاد قرار دیتی ہے، اسی لیے دونوں نظمیں مل کر عورت کی جدوجہد کی ایک مکمل اور متوازن تصویر پیش کرتی ہیں۔

اردو شاعری میں عورت کا موضوع محض جذباتی یا روایتی بیان تک محدود نہیں رہا بلکہ وقت کے ساتھ یہ ایک گہرے فکری اور سماجی مباحثے کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ خاص طور پر جدید اردو شاعری میں یہ امر نہایت معنی خیز ہے کہ عورت کے مسائل، اس کی محرومیاں اور اس کی جدوجہد کو صرف خواتین شعرا نے ہی نہیں بلکہ مرد شعرا نے بھی شدتِ احساس کے ساتھ بیان کیا ہے۔ بظاہر یہ تصور عام ہے کہ مرد سماج نے عورت کو دبایا اور اس کی آزادی پر قدغن لگائی ہے، مگر ادبی منظر نامہ اس خیال کی ایک رُخی کو توڑ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ کئی مرد شعرا نے نہ صرف عورت کے حق میں آواز اٹھائی بلکہ اسے بیداری، خود اعتمادی اور مساوات کا پیغام بھی دیا۔

ادب میں ایک ہی موضوع مختلف تخلیق کاروں کے یہاں مختلف فکری اور تجرباتی صورتوں میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ شاعر کا سماجی پس منظر، اس کے تجربات اور اس کی فکری وابستگیوں اس کے اظہار کو منفرد بنا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب دو شاعر ایک ہی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو ان کی تخلیقات نہ صرف انفرادی شعور کی عکاسی کرتی ہیں بلکہ اپنے عہد کے مختلف فکری رویوں کو بھی سامنے لاتی ہیں۔ فہمیدہ ریاض کی نظم ”انقلابی عورت“ اور کیفی اعظمی کی نظم ”عورت“ اسی نوعیت کی دو اہم نظمیں ہیں جو ایک ہی موضوع کے باوجود اپنے لہجے، نقطہ نظر اور اظہار کے اعتبار سے الگ الگ جہتوں کی نمائندگی کرتی ہیں۔

فہمیدہ ریاض بطور عورت اپنی ذات کے اندر اتر کر اس کرب، تھکن اور خاموش جدوجہد کو لفظ دیتی ہیں جسے عورت صدیوں سے جیتی آئی ہے، جبکہ کیفی اعظمی بطور مرد عورت کو محض ہمدردی کا نہیں بلکہ شراکت اور عمل کا پیغام دیتے ہیں۔

یوں یہ نظمیں ہمیں یہ احساس دلاتی ہیں کہ نسائی شعور کسی ایک جنس تک محدود نہیں بلکہ ایک مشترکہ انسانی آگہی ہے۔ جہاں عورت اپنی کہانی خود سناتی ہے اور مرد اس کہانی کو سماج کی آواز بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور یہی فکری اشتراک ان نظموں کو محض شاعری نہیں بلکہ ایک سماجی دستاویز بنا دیتا ہے۔

فہمیدہ ریاض کی نظم ”انقلابی عورت“ جس میں عورت کے باطنی تجربے اور اس کی عمر بھر کی جدوجہد کو نمایاں کیا گیا ہے۔ یہ نظم دراصل عورتوں کی داستان ہے جن کی زندگی ایک رن بھومی کی مانند ہے، اور اسی میدان زندگی میں وہ بچپن ہی سے قدم رکھ دیتی ہیں۔ کم عمری سے ہی ذمہ داریاں، سماجی توقعات اور بیشمار سمجھوتے ان کے حصے میں آجاتے ہیں۔ فہمیدہ ریاض اس نظم کے ذریعے یہ باور کراتی ہیں کہ عورت کی زندگی کا سفر اکثر مرد سے مختلف اور کہیں زیادہ کٹھن ہوتا ہے؛ اسے اپنے وجود کو منوانے، اپنے حق کے لیے سوچنے اور ہر موڑ پر خود کو ثابت کرنے کی مسلسل جدوجہد سے گزرنا پڑتا ہے۔ بظاہر نرم اور خاموش نظر آنے والی عورت دراصل صبر، ہمت اور برداشت کی ایک زندہ مثال بن کر ساری عمر زندگی کی اس جنگ میں مصروف رہتی ہے۔

رن بھومی میں لڑتے لڑتے میں نے کتنے سال
اک دن جل میں چھایا دیکھی چٹے ہو گئے بال
پاپڑ جیسی ہوئیں ہڈیاں جلنے لگے ہیں دانت
جگہ جگہ جھریوں سے بھر گئی سارے تن کی کھال

ان اشعار کے ذریعے فہمیدہ ریاض عورت کی طویل اور مسلسل جدوجہد کی ایک نہایت موثر تصویر پیش کرتی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ عورت دوسروں کی خدمت، ذمہ داریوں اور زندگی کی کشمکش میں اس قدر مصروف رہتی ہے کہ اسے گزرنے والے وقت کی رفتار کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ وہ اپنے خوابوں، خواہشوں اور اپنی ذات کو پس پشت ڈال کر دوسروں کے لیے جیتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک دن اچانک اسے محسوس ہوتا ہے کہ عمر خاموشی سے اس کے چہرے اور جسم پر اپنی تحریر ثبت کر چکی ہے۔ سفید ہوتے بال، کمزور ہڈیاں، زرد ہوتے دانت اور جھریوں سے بھری جلد اس بات کی علامت ہیں کہ اس نے اپنی پوری زندگی جدوجہد، قربانی

اور مسلسل محنت میں گزار دی ہے۔ شاعرہ ان علامتوں کے ذریعے اس تلخ حقیقت کو اجاگر کرتی ہیں کہ عورت اکثر اپنی ذات کے لیے جینے کا موقع پائے بغیر عمر کی آخری منزلوں تک پہنچ جاتی ہے، لیکن اس کے باوجود اس کی جدوجہد اور حوصلہ ختم نہیں ہوتا۔

دیکھ کے اپنا حال ہوا پھر اس کو بہت ملال
ارے میں بڑھیا ہو جاؤں گی آیا نہ تھا خیال

اس نے سوچا

گر پھر سے مل جائے جوانی
جس کو لکھتے ہیں دیوانی

اور مستانی

جس میں اس نے انقلاب لانے کی ٹھانی

وہی جوانی“

یہاں فہمیدہ ریاض ایک نہایت گہرے اور کربناک لمحے کو بیان کرتی ہیں— وہ لمحہ جب عورت مڑ کر اپنی زندگی کو دیکھتی ہے اور محسوس کرتی ہے کہ زندگی بڑی خوبصورت تھی لیکن وہ ذمہ داریوں کے سبب زندگی جی نہ سکی۔

جب لڑکی جوان ہوتی ہے تو اس کی زندگی میں بڑے خواب ہوتے ہیں، بڑی امیدیں ہوتی ہیں وہ دھنک رنگ خوابوں کی چادر اوڑھے اپنی گرجہستی میں قدم رکھتی ہے۔ اور اس وقت اسے اپنی زندگی بڑی ہی دلکش اور رنگین معلوم ہوتی ہے لیکن آہستہ آہستہ وہ اپنی زندگی کے سبھی رنگ اپنی اولاد اپنے خاندان میں منتقل کرتی جاتی ہے اور ایک دن جب وہ اپنے دامن کو دیکھتی ہے تو اسے احساس ہوتا ہے جیسے اس کی زندگی میں کوئی رنگ باقی نہ رہا۔

یہی احساس اس کے دل میں ایک کسک پیدا کر دیتا ہے کہ شاید وہ زندگی کو پوری طرح جی ہی نہ سکی۔ تب اس کے اندر ایک خواہش جاگتی ہے— کاش جوانی ایک بار پھر لوٹ آئے تاکہ وہ کم از کم اپنے لیے جینے کا ہنر سیکھ سکے اور اپنے خوابوں کو تعبیر دے سکے۔ اسے بڑی شدت سے یہ احساس ہوتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی دوسروں پر قربان کر دی اور وہ اب کہیں نہ کہیں اپنے آپ سے وعدہ کر رہی ہے کہ اگر اس کو جوانی واپس مل جائے تو وہ اس کو ایسے ہی نہیں گنوائے گی اصل میں ہمیں بہت ساری چیزوں کا احساس وقت کے گزر جانے کے بعد ہوتا ہے۔ اور اس نظم میں بھی یہی جذبہ نظر آتا ہے۔

اب کی بار نہیں دوں گی کوئی قربانی
بس لاجول پڑھوں گی اور نہیں دوں گی کوئی قربانی

دل نے کہا

کس سوچ میں ہے اے پاگل بڑھیا

کہاں جوانی

یعنی اس کو گزرے اب تک کافی عرصہ بیت چکا ہے

یہ خیال بھی دیر سے آیا

بس اب گھر جا

اس حصے میں شاعرہ عورت کے اندر بیدار ہونے والی خود آگہی کو پیش کرتی ہیں، مگر ساتھ ہی وقت کی بے رحمانہ حقیقت کو بھی نمایاں کرتی ہے۔ عورت ایک لمحے کے لیے یہ عزم کرتی ہے کہ اگر اسے دوبارہ زندگی جینے کا موقع ملا تو وہ خود کو فراموش نہیں کرے گی اور نہ ہی اپنی تمام خواہشات دوسروں پر قربان کرے گی، لیکن اسی لمحے حقیقت اس کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ دل اسے یاد دلاتا ہے کہ جس جوانی کو وہ دوبارہ حاصل کرنا چاہتی ہے، وہ اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے اور واپس نہیں آسکتی۔ فہمیدہ ریاض یہاں نہ صرف ایک فرد کی کیفیت بیان کرتی ہیں بلکہ اس اجتماعی ایسے کی طرف اشارہ کرتی ہیں جس کا سامنا بے شمار عورتیں کرتی ہیں۔ سماجی دباؤ اور زندگی کی مصروفیات عورت کو صرف گریہ اور رشتوں میں الجھا کر رکھ دیتے ہیں جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی اپنے رشتوں کے نام کر دیتی ہے اور جب اس کا شعور بیدار ہوتا ہے تو وقت بہت آگے نکل چکا ہوتا ہے۔ فہمیدہ ریاض اسی احساس کے ذریعے یہ پیغام دیتی ہیں کہ انسان کو اپنی ذات، اپنے خوابوں اور اپنی خواہشات کی قدر بروقت کرنی چاہیے، کیونکہ بعض حقیقتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا ادراک اگرچہ انسان کو بالغ نظر بنا دیتا ہے، لیکن وہ گزرا ہوا وقت واپس نہیں لاسکتا۔

بڑھیا نے کب اس کی مانی

حالانکہ اب وہ ہے نانی

ظاہر ہے اب اور وہ کر بھی کیا سکتی تھی

آسمان پر لیکن تارے آنکھ مچولی کھیل رہے تھے

رات کے پچھلی بول رہے تھے

اور کہتے تھے

یہ شاید اس کی عادت ہے

یا شاید اس کی فطرت ہے

ان مصرعوں میں فہمیدہ ریاض ایک لطیف اشارہ کرتی ہیں کہ جدوجہد گویا عورت کی فطرت بن چکی ہے۔ عورت جب رشتوں کے بندھن سے آزادی حاصل کر لیتی ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ رشتوں کو عورت کی ضرورت نہیں ہوتی تب عورت کو عمر کے آخری حصے میں یہ احساس ہوتا ہے وہ جن رشتوں کے لیے جی رہی تھی ان رشتوں کو اب اس کی ضرورت نہیں وہ ایک بار پھر ہمت کر کے تاروں کی چمچماتی روشنی سے امیدوں کے گھروندے بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ گویا اس میں جینے کا حوصلہ اب بھی باقی ہو۔

مجموعی طور پر فہمیدہ ریاض کی یہ نظم عورت کی پوری زندگی کا استعارہ بن کر سامنے آتی ہے۔ ایک ایسی زندگی جو بچپن کی معصومیت سے شروع ہو کر ذمہ داریوں، قربانیوں اور مسلسل جدوجہد سے گزرتی ہے۔ وہ گویا سماج کو متوجہ کرتی ہیں کہ عورت کی خاموش لڑائی کو معمولی نہ سمجھا جائے، کیونکہ وہ صرف دوسروں کے لیے جینے والی ہستی نہیں بلکہ اپنے خوابوں، اپنی خواہشات اور اپنی پہچان کی بھی حق دار ہے۔

اسی موضوع کو ایک مختلف زاویہ ہی نظر سے کیفی اعظمی نے بھی بیان کیا ہے جہاں عورت صرف برداشت کرنے والی نہیں بلکہ بیداری اور تبدیلی کی علامت بن کر سامنے آتی ہے۔

کیفی اعظمی کی نظم ”عورت“ عورتوں کی بیداری اور سماجی آزادی کا ایک انقلابی منشور ہے۔ شاعر عورت کو جھجھوڑ کر اسے حرکت، شعور اور خود اعتمادی کی طرف بلاتا ہے:

اٹھ مری جان مرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

قلبِ ماحول میں لرزاں شررِ جنگ ہیں آج

حوصلے وقت کے اور زلیت کے یک رنگ ہیں آج

ان اشعار میں شاعر اس بات کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ زمانہ بدل چکا ہے اور معاشرہ ایک نئی کشمکش سے گزر رہا ہے۔ ایسے حالات میں عورت کا خاموش یا الگ تھلگ رہنا ممکن نہیں۔ اسے مرد کے شانہ بشانہ چلنا ہوگا، کیونکہ زندگی کی جدوجہد اب دونوں کی مشترکہ ذمہ داری ہے۔ شاعر یہاں عورت کو کمزور نہیں بلکہ حالات کا مقابلہ کرنے والی ہستی کے طور پر پیش کرتا ہے۔

تیرے قدموں میں ہے فردوسِ تمدن کی بہار

تیری نظروں پہ ہے تہذیب و ترقی کا مدار

تیری آغوش ہے گہوار، ہی نفس و کردار

یہاں شاعر عورت کی اہمیت کو نہایت بلند مقام دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تہذیب، اخلاق اور ترقی کی بنیاد دراصل عورت ہی ہے، کیونکہ وہی نسلوں کی تربیت کرتی ہے اور معاشرے کے کردار کو تشکیل دیتی ہے۔ اس انداز سے کیفی اعظمی عورت کو محض نجی زندگی تک محدود نہیں رکھتے بلکہ اسے پوری انسانی تہذیب کی معمار قرار دیتے ہیں۔

قدر اب تک تری تاریخ نے جانی ہی نہیں

تجھ میں شعلے بھی ہیں بس اشکِ فشانہ ہی نہیں

اپنی تاریخ کا عنوان بدلنا ہے تجھے

اٹھ میری جان میرے ساتھ ہی چلنا ہے تجھے

اپنی اس نظم میں کیفی اعظمی عورت کو روایتی دائرے سے نکال کر ایک نئے سماج سے روشناس کراتے ہیں۔ جہاں مرد اور عورت دونوں برابر ہیں۔ اس نظم میں ایک شاعر عورتوں کو تلقین دیتا ہے اور انہیں ان کی اہمیت کا اور ان کی خوبیوں کا احساس دلاتا ہے اور کہتا ہے کہ تاریخ نے عورت کی طاقت اور صلاحیتوں کو مکمل طور پر تسلیم نہیں کیا۔ عورت کو اکثر کمزور اور صرف جذباتی مخلوق سمجھا گیا، جبکہ اس کے اندر انقلاب برپا کرنے کی قوت موجود ہے۔ اسی لیے شاعر اسے دعوت دیتا ہے کہ وہ اپنی نئی پہچان خود قائم کرے اور اپنی تاریخ کو از سر نو پھر سے تحریر کرے۔

توڑ کر رسم کا بت بندِ قدامت سے نکل

ضعفِ عشرت سے نکل وہمِ نزاکت سے نکل

قید بن جائے محبت تو محبت سے نکل

یہ اشعار روایتوں اور فرسودہ خیالات کے خلاف ایک واضح اعلان ہیں۔ شاعر عورت کو یہ پیغام دیتا ہے کہ وہ جھوٹی نزاکت، بیجا شرم اور ان رسموں کو توڑ دے جو اس کی ترقی میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اگر کوئی تعلق یا محبت بھی اس کی آزادی کو سلب کرے تو اسے اس قید سے نکل آنا چاہیے۔ یہاں آزادی فکر اور خود مختاری کا تصور پوری شدت سے نمایاں ہوتا ہے۔

تو فلاطون و ارسطو ہے تو زہرا پرویں

تیرے قبضے میں ہے گردوں تری ٹھوکر میں زمیں

میں بھی رکنے کا نہیں وقت بھی رکنے کا نہیں

آخر میں شاعر عورت کی ذہنی اور تخلیقی صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے اسے عظیم مفکرین کے برابر لا کھڑا کرتا ہے اور یہ پیغام دیتا ہے کہ اگر عورت اپنی قوت کو پہچان لے تو کوئی منزل اس کی پہنچ سے دور نہیں ہے۔

ایک طرف فہمیدہ ریاض وقت گزر جانے کا نوحہ کرتی ہیں اور یہ امید کرتی ہیں کہ کاش وقت پھر سے واپس آجائے اور دوسری طرف کیفی اعظمی وقت گزرنے کا فلسفہ بیان کرتے ہیں کہ وقت کبھی کسی کے لیے نہیں رکتا۔

ہمیں یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ کیفی اعظمی اور فہمیدہ ریاض اردو شاعری کی وہ نمایاں آوازیں ہیں جنہوں نے عورت کے وجود، اس کے شعور اور اس کی داخلی کیفیت کو نہایت گہرائی سے بیان کیا ہے۔ حالانکہ دونوں کی شاعری کا زاویہ؟ نظر ایک دوسرے سے مختلف ہونے کے باوجود بھی ایک ہی مقصد کا احاطہ کرتا ہے کہ عورتوں کو ان کی اصل پہچان حاصل ہو اور ان کے حقوق کا اعتراف کیا جائے۔ ایک طرف کیفی اعظمی عمل اور انقلاب کا پیغام دیتے ہیں، تو دوسری طرف فہمیدہ ریاض کی شاعری میں وقت گزرنے کا پچھتاوا، ادھورے خوابوں کا کرب اور دیر سے حاصل ہونے والے شعور کی کسک کے ساتھ ساتھ ایک ہلکی سی امید کی مدھم روشنی بھی نظر آتی ہے۔

کیفی عظمیٰ کی نظم ایک پُر جوش اور انقلابی صدا بن کر ابھرتی ہے لیکن وہ اسے نعرہ بازی نہیں بننے دیتے۔ وہ عورت کو جھنجھوڑتے ہیں، اس کے اندر چھپی ہوئی طاقت کو بیدار کرتے ہیں اور اسے حالات کا مقابلہ کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔

کیفی عظمیٰ کے یہاں عورت کمزور نہیں بلکہ معاشرے میں تبدیلی لانے والا انقلاب ہے۔ یہ ایک ایسی ہستی ہے جو اگر بیدار ہو جائے تو معاشرے کا دھارا بدل سکتی ہے۔

اس کے برعکس فہمیدہ ریاض کی شاعری کا لہجہ زیادہ داخلی، کریناک اور اعتراضی محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ ان کی نظم پچھتاوے اور نوے کی منزلوں کو طے کرتے ہوئے بار بار اس احساس کو جنم دیتی ہے کہ عورت کے اندر خواہشات، امنگلیں اور انقلاب کی آرزو تو موجود تھی، مگر سماجی بندشوں نے اسے جینے کا موقع نہ دیا۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ دل ہی دل میں یہ آرزو کرتی ہیں کہ کاش وقت کا پہیہ الٹا گھوم سکے اور گزری ہوئی جوانی ایک بار پھر لوٹ آئے۔ یہ خواہش دراصل ان خوابوں، تمناؤں اور امکانات کو دوبارہ حاصل کرنے کی تڑپ ہے جو زندگی کی مصروف راہوں میں کہیں کھو گئے تھے۔

اگر دونوں شاعروں کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو ایک دلچسپ تضاد سامنے آتا ہے۔ کیفی عظمیٰ مستقبل کی طرف دیکھتے ہیں اور وہ عورت کو آواز دیتے ہیں کہ ابھی وقت ہے، اٹھو اور اپنی دنیا بدل دو۔ جبکہ فہمیدہ ریاض ماضی کی طرف دیکھ کر خبردار کرتی ہیں کہ اگر عورت نے خود کو نہ پہچانا تو وہ حسرتوں کے سوا کچھ حاصل نہیں کر پائے گی۔

قابل غور بات یہ ہے کہ فہمیدہ ریاض کی نظم کا عنوان ”انقلابی عورت“ ہونے کے باوجود اس میں انقلاب کا تصور زیادہ تر داخلی احساس، شعور کی بیداری اور گزرے ہوئے وقت پر غور و فکر کے بعد ابھرتا ہے۔ یعنی انقلاب ایک دیر سے پیدا ہونے والی کیفیت کے طور پر سامنے آتا ہے جو زندگی کے تجربات اور احساسِ زیاں سے گزر کر جنم لیتا ہے۔ اس کے برعکس کیفی عظمیٰ کی نظم ”عورت“ اپنے عنوان کے اعتبار سے سادہ ہونے کے باوجود اپنے اندر زیادہ واضح، براہِ راست اور عملی انقلابی سوچ رکھتی ہے۔ وہ عورت کو ابتدا ہی سے ایک متحرک، باشعور اور تبدیلی کی قوت کے طور پر پیش کرتے ہیں جو وقت کے ضیاع پر رونے کے بجائے وقت کو پہچاننے اور اسے اپنے حق میں استعمال کرنے کا حوصلہ رکھتی ہے۔

اس تناظر میں یہ بات مکمل طور پر واضح ہو جاتی ہے کہ فہمیدہ ریاض کی نظم کا عنوان اگرچہ انقلابی عورت ہے، لیکن اس میں انقلابی رنگ نسبتاً کم نظر آتا ہے۔ اس کے مقابلے میں کیفی عظمیٰ کی نظم کا عنوان اگرچہ صرف عورت ہے، لیکن اس میں عورت کی سادگی اور انقلابی روح زیادہ نمایاں ہے، اور فہمیدہ ریاض کے مقابلے میں کیفی عظمیٰ کی عورت زیادہ انقلابی معلوم ہوتی ہے۔

یہی پہلو دونوں نظموں کے مطالعے کو ایک واضح سمت دیتا ہے اور ان کے فکری فرق کو سمجھنے میں مدد فراہم کرتا ہے۔ اسی بنیاد پر جب دونوں نظموں کو ایک ساتھ دیکھا جائے تو ان کے لہجے اور شعور کی نوعیت نمایاں طور پر الگ محسوس ہوتی ہے۔

فہمیدہ ریاض کی شاعری میں ماضی کے کرب کے ساتھ ساتھ مستقبل کی دھندلی سی امیدیں بھی موجود ہیں، جہاں عورت کو یہ پیغام ملتا ہے کہ زندگی کسی بھی عمر میں دوبارہ شروع کی جاسکتی ہے۔ البتہ ہر لمحہ گزرتے وقت کا پچھتاوا بھی اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہتا ہے۔

جبکہ کیفی اعظمی کی شاعری ایک ولولہ انگیز پکار۔ ایک امید اور بیداری کی صدا ہے۔ جو پچھتاوے سے پہلے عمل کی دعوت دیتی ہے۔

نتیجتاً یہ کہا جاسکتا ہے کہ دونوں کی شاعری مل کر عورت کی مکمل تصویر پیش کرتی ہے۔ ایک وہ عورت جو وقت گزر جانے پر اپنے خوابوں کا ماتم تو کرتی ہے لیکن اس کے بعد پھر نئی زندگی کے خواب سجانا بھی چاہتی ہے۔ اور دوسری وہ عورت جو وقت پر بیدار ہو کر اپنی زندگی سنوارنے کا جذبہ رکھتی ہے۔

ان نظموں کا مشترکہ پیغام یہی ہے کہ عورت اپنی طاقت کو پہچانے، کیونکہ زندگی انتظار نہیں کرتی۔ جو لمحہ گزر جائے وہ واپس نہیں آتا، اس لیے بیداری ہی نجات کا راستہ ہے۔

یہ نظمیں عورت کی پوری زندگی کا احاطہ کرتی ہیں اور اسے زندگی جینے کی ترغیب دے کر ایک نئی بصیرت فراہم کرتی ہیں، جو ان کی زندگی کا نچوڑ ہے۔

دونوں کی آوازیں مل کر ایک ہی سچ بیان کرتی ہیں کہ زندگی انتظار کرنے والوں کو نہیں، ہمت کرنے والوں کو ملتی ہے۔ اسی ہم آہنگی میں ان نظموں کا اصل حسن پوشیدہ ہے۔ ان نظموں کو پڑھ کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عورت سے کہا جا رہا ہو: وقت کو پہچانو، خود کو پہچانو، کیونکہ جو لمحہ تمہارے پاس ہے۔ وہی تمہاری اصل زندگی ہے۔ اپنی ایک اور نظم میں فہمیدہ ریاض سبھی عورتوں کو بیداری کا پیغام دیتی ہیں جو کیفی اعظمی کی شاعرانہ بصیرت سے ہو بہو میل کھاتا ہے۔

یہی کہیں ہو سکتا ہے کچھ اور، تو اکثر ہوتا ہے
پر تم جس لمحے میں زندہ ہو، یہ لمحہ تم سے زندہ ہے
یہ وقت نہیں پھر آئے گا
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

حوالے:

۱. فہمیدہ ریاض۔ کلام فہمیدہ ریاض۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز
۲. کیفی اعظمی۔ آواز آدم۔ نئی دہلی: مختلف ایڈیشنز۔
۳. محمد حسن۔ اردو ادب کی تنقیدی تاریخ۔ نئی دہلی۔

۴. گوپی چند نارنگ۔ ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل پبلسنگ ہاؤس۔
۵. وزیر آغا۔ تنقیدی مضامین۔ لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز۔
۶. آل احمد سرور۔ ادب اور نظریہ۔ نئی دہلی: ایجوکیشنل بک ہاؤس۔

